© rasailojaraid.com

قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل اور مسئلہ کشمیر *

پروفیسر لارنس زیرنگ

کشمیر میں ابھرنے والا منظر نامہ قائداعظم محمد علی جناح کے لیے قطعاً حیران کن اور غیر متوقع تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے من مانے طریقے سے جس طرح ویول پلان کو نظر انداز اور ایٹلی حکومت کے ۱۹۴۹ء کے موسم گرما تک برصغیر سے رخصت ہو جانے کے ارادے کو جس طرح مسترد کر دیا، اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے سنگین حالات کے اثرات سے ریاست جموں و کشمیر اور برصغیر کے اکثر شمال مغربی علاقے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔[۱] ذاتی طور پر قائداعظم کی جانب سے پاکستان اور ہندوستان کے مشترکہ گورنر جنرل بننے کی خواہش کے ردّ کی وجہ سے برانگیختہ ماؤنٹ بیٹن نے جس جلد بازی میں اس خطہ سے برطانوی حکومت کے بوریا بستر کو سمیٹنے کا فیصلہ کیا، اس کے نتیجہ میں جناح اور ان کی جماعت کو ایک نئی قوم کی تشکیل اور حکومت سازی کے لیے بمشکل چند ہفتے ہی مل سکے۔ یہاں پہ اس پس منظر میں یہ بات بھی مدنظر رکھی جانی چاہیے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کے قریبی حلقہ میں شاید ہی کسی نے سنجیدگی سے یہ سوچا ہو کہ پاکستان اپنے قیام کے چھ ماہ تک بھی اپنی ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا۔[۲] اس پر طرّہ یہ کہ کانگرس کے اہم رہنما بھی یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ اقتدار حاصل کرنے والی تنظیم مسلم لیگ جو بالکل واضح طور پر شہروں تک محدود ایک چھوٹی سی تنظیم تھی، وہ ایک کثیر النوع آبادی، صوبائیت اور قبائلی طرز فکر سے دوچار معاشرہ کو متحد اور یکجان رکھ سکے گی۔ اس وقت پاکستان کا حصہ بننے والے علاقوں اور ان کی آبادی کی بڑی تعداد کی نمائندگی ابھی تک زمیندار اور فیوڈل طبقہ کے پاس تھی۔ ان میں سے مؤخر الذکر کے لیے جناح کے ہاتھوں خطّہ کے جغرافیہ میں رونما ہو جانے والی تبدیلی اس لیے خاص طور پر بڑی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی کہ برطانوی حکمرانوں نے تقسیم کے وقت مسلم لیگ کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنی اس آبادی تک اس فیصلہ کی تفصیلات پہنچا سکتی جنہوں نے اس تقسیم کی بدولت سب سے زیادہ متاثر ہونا تھا۔ کشمیر کا مسئلہ بھی دیگر کئی باہمی طور پر الجھے ہوئے تنازعات میں سے ایک تنازعہ تھا جس کا قائد کو اقتدار سنبھالنے کے بعد سامنا کرنا تھا۔[۳]

آزادی کی ایک طویل اور تھکا دینے والی جدوجہد کے نتیجہ میں قیام پاکستان کے موقع پر قائداعظم شدید علیل تھے۔ کردار کی پختگی اور مطالبۂ پاکستان پر مکمل یقین کی دولت سے مالا مال یہ شخص اپنی صحت سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف وہ اپنے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے بھی مکمل طور پر تیار تھے۔ چنانچہ شدید دباؤ

مترجم: صبور علی سید، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی وجہ سے انہوں نے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرلیا کہ روزمرہ حکومتی معاملات لیاقت علی خان کی کابینہ سنبھال لے گی اوران کا عہدہ محض علامتی اور رسمی ہوگا۔قائد کے نزدیک نئی وجود میں آنے والی حکومت کوایک طرف قانونی جواز مل جائے گا تو دوسری طرف اس سے بکھری ہوئی منتشر قوم کو یکجا کیا جا سکے گا۔تاہم جلد ہی انہیں اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا کہ مسلم لیگ ان کی ذات کومنہا کر کے حکومتی معاملات چلانے کی اہلیت رکھتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ لیاقت علی خان کے حکومتی امور چلانے کی اعلانیہ خواہش کے اظہار کے باوجود جناح کووزیراعظم کے فرائض سنبھالنا پڑے جس سے ان کی صحت پر بڑے منفی اثرات پڑے۔[۴]

مگر درحقیقت انہیں صحیح معنوں میں نڈھال اس سے بھی بڑھ کر درپیش سنگین اور پیچیدہ معاملات نے کیا۔انہیں داخلی طور پر سراٹھانے والی مشکلات کا اندازہ تو تھا لیکن تقسیم کے نتیجہ میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات ان کے لیے ایک آفت ناگہانی تھے۔انہیں اس وقت اور بھی رنج پہنچا کہ فسادات کا سلسلہ چنداں تھمنے میں نہیں آرہا تھا اور انگریز حکمران اسے روکنے میں (خاص طور پر پنجاب میں) ناکام ہوگئے تھے۔اس طرح اس موقع پر برطانوی افواج کی تقسیم بھی ایک پیچیدہ تنازعہ بن گئی۔اس سے قبل تقسیم برصغیر کے لیے مذاکرات میں دونوں فریق افواج کی منصفانہ تقسیم پر پہلے ہی رضامند ہوچکے تھے لیکن آزادی کے موقع پر باہمی کشیدگی کے فروغ کے ساتھ ہی ہندو حکومت اپنا وعدہ بھول کر اسلحہ کی تقسیم میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگی۔برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف سر کلاڈ آکنلیک کو بھی کانگریس کی پالیسی کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جس نے تقسیم کے بعد جلد ہی ان کے فوجی ہیڈکوارٹرز ختم کردیے۔وہ گو کہ تقسیم کے بعد کچھ عرصہ تک دہلی میں مقیم رہے اور دونوں افواج کے مشترکہ کمانڈر انچیف بھی وہی تھے لیکن اس کے باوجود اس دوران برطانیہ برصغیر کے معاملات سے الگ تھلگ رہا۔[۵] یہی وجہ تھی کہ آکنلیک نے قائد کی اس درخواست پر کہ برطانوی فوج فرقہ وارانہ فسادات کو روکے اور معصوم انسانوں کی جانوں کو بچانے کے لیے اپنا کردار ادا کرے، خاموشی اختیار کرلی۔اس نے غیر جانبداری کا یہ رویہ اس وقت بھی برقرار رکھا جب قائد نے اس پر زور دیا کہ وہ ہندوستانی فوج کو کشمیر میں داخل ہونے سے باز رکھے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ برطانیہ نے لندن اور برصغیر دونوں مقامات پر اپنے تئیں ہندوستان کو جلد از جلد خیر باد کہنے کا فیصلہ کرلیا تھا جبکہ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان کا علامتی سربراہ بن جانے سے بھی یہ واضح ہو چکا تھا کہ برطانیہ ایسے کسی بھی اقدام سے گریز کرے گا جس سے مسئلہ کوئی پیچیدہ شکل اختیار کرلے یا خطہ سے اس کی دستبرداری کے عمل میں تاخیر واقع ہوجائے۔برصغیر کی تقسیم کے ذریعہ تمام اسلحہ ساز فیکٹریاں، گودام بڑی تعداد میں فوجی تربیتی ادارے (اس موقع میں ہندوستان میں کل ۴۶ فوجی تربیتی ادارے تھے جن میں سے صرف ۷ پاکستان کے حصہ میں آئے جن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں صرف سٹاف کالج کوئٹہ کسی اہمیت کا حامل تھا) ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ اس کے برعکس پاکستان کو اپنی فوج اور فضائیہ کو عملاً بالکل صفر سے تعمیر کرنا تھا۔[6] علاوہ ازیں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ برطانیہ نے اپنی سامراجی پالیسی کے تحت فوج میں 'کلاس' یونٹ قائم کیے ہوئے تھے جو کلی طور پر ہندوؤں جیسے مرہٹوں اور ڈوگروں وغیرہ پر مشتمل تھے۔ اس کے برعکس مسلمان فوجی فارمیشنز میں انہوں نے غیر مسلموں کو بھی شامل کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے برعکس ہندوستان کے لیے فوج کی تشکیل چنداں مشکل ثابت نہیں ہوئی کیونکہ اس نے برطانوی دور میں تشکیل شدہ فوج کے پورے کے پورے یونٹوں کو یونہی کھڑا کر کے نئی فوج بنا دی۔ دوسری طرف اکتوبر ۱۹۴۷ء یعنی آزادی کے دو ماہ کے بعد بھی پاکستان ابھی تک اپنے ابتدائی فوجی یونٹ تشکیل دے رہا تھا اور ماضی کی طرح اب بھی اس کے کئی اہم فوجی عہدے ہندو اور سکھ افسران کے پاس تھے۔ زیادہ درست بات تو یہ ہے کہ پاکستانی G.H.Q. کئی ہندو افسران پر مشتمل تھا۔ چنانچہ اس بھاری ذمہ داری کے پیش نظر کہ پاک فوج کو پیدا شدہ حالات کی وجہ سے سرحد پار سے مہاجرین کی بے پناہ تعداد کو اپنے ملک لانا تھا، وہ کسی بھی لحاظ سے ۱۹۴۸ء کے موسم بہار میں ہندوستان کے کشمیر پر حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

برطانیہ کی برصغیر میں رونما ہونے والے حالات سے مکمل بے اعتنائی اور ماؤنٹ بیٹن کی ہندوستان نوازی کے باعث قائداعظم کے پاس محض چند ایک متبادل حل ہی رہ گئے تھے۔ تنازعہ کشمیر نے اس ضرورت کو اور بھی دو چند کر دیا تھا کہ اولین فرصت میں ایک باضابطہ اور منظم فوج تشکیل دی جائے۔ بحثییت ایک وکیل اور آئین کی بالا دستی پر یقین رکھنے والے انسان کے محمد علی جناح کو یقین تھا کہ دولت مشترکہ رکن ممالک کے درمیان باہمی تنازعات کے حل کے لیے بہترین نظام فراہم کرتی ہے۔ لیکن انہیں اس بات کا شدید رنج تھا کہ ماؤنٹ بیٹن اور وائٹ ہال نے دونوں ممالک کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی کو دور کرنے کے لیے مصالحتی کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔[7] یہ چیز اس لحاظ سے بھی بڑی تکلیف دہ تھی کہ پاکستانی عوام برطانیہ سے اس کردار کی پوری توقع رکھتے تھے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران مسلم لیگ نے اس کی حمایت کی تھی اور اب وقت آ گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی قربانیوں کا لحاظ رکھتا۔

یہ محض چند ہی سال قبل کی بات تھی کہ کانگرس نے برطانیہ کی جنگ کی پالیسی کی مخالفت کی تھی اور جاپان کے تعاون سے انڈین نیشنل آرمی کھڑی کی تھی جسے بغاوت گردانا گیا تھا۔ لیکن اب جنگ کے نتیجہ اور برصغیر سے انگریزوں کی دستبرداری کے باعث پیدا ہونے والے حالات کی روشنی میں انگریزوں کی سوچ ڈرامائی طور پر بدل چکی تھی۔ یوں پاکستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ کچھ انگریز فوجی اور انتظامی عہدے داران بدستور نومولود ریاست میں اپنے فرائض ادا کرتے رہے لیکن مجموعی طور پر قائد کی یہ سوچ یا گمان کہ برطانیہ اس مشکل مرحلہ پر پاکستان کی مدد کرے گا نقش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بر آب ثابت ہوا۔

اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان عالمی تنہائی سے دوچار ہے اور کوئی مسلمان ملک اس کی مدد کرنے کے قابل نہیں جبکہ سرحد کا ملک افغانستان بھی اس کی آزادی پر پیچ و تاب کھائے ہوئے ہے، جناح نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ ملکی مسائل کے حل کے لیے وہ لیاقت علی خان کو بے اختیار کر کے زیادہ بڑے پیمانے پر اپنا کردار ادا کریں۔ بلکہ انہوں نے لیاقت علی کو ان کے عہدہ سے برخاست بھی کرنا چاہا لیکن غیر موزوں حالات اور ان کی ناراضگی کے خدشہ کے باعث انہیں اپنا ذہن بدلنا پڑا۔[۸] جناح کے لیے پاکستان کا مستقبل تشویش کا باعث تھا نہ کہ ایک ایسے وزیر اعظم کو برطرف کرنا جو بزعم خود مضبوط عوامی حمایت رکھتا تھا۔ چنانچہ انہیں مجبوراً وہ سیاسی اقدامات اپنے ہاتھ میں لینے پڑے جو ملک کے استحکام کے لیے کرنا ضروری تھے۔ اب وہ ایک طرف ملک کے مغربی صوبوں میں موجود سیاسی طور پر چھائی ہوئی بااثر اور طاقتور زمیندار طبقہ کو بے اثر کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف وہ لیاقت علی کو وزیر اعظم برقرار رکھ کر شہری اور آزاد خیال طبقہ کی اس خواہش کا بھی احترام کر رہے تھے کہ پاکستان کو ایک جدید اور روشن خیال آئینی ریاست بنایا جائے جہاں قانون کا احترام اور مختلف زبانوں اور قومیتوں کو تحفظ حاصل ہو۔

تاہم ایک ایسی ریاست میں جو جغرافیائی طور پر کٹی پھٹی تھی، جس کے دو خطوں کے درمیان ہزاروں میل ہندوستان کا علاقہ واقع تھا۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین اُمڈے چلے آ رہے تھے اور فیصلہ سازی سے محروم صوبے باہمی سیاسی مخاصمت میں الجھے ہوئے تھے، جب کہ پڑوسی ممالک جارحانہ عزائم کا اظہار کر رہے تھے، جناح کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔[۹]

جناح پر عائد ذمہ داریاں:

آزادی سے قبل کے ماہ و ایام کے دوران جناح کی تمام تر توجہ اور توانائی اس بات پر مرکوز رہی کہ طرح طرح کے مخالفین کی مخالفت کو کسی طرح زائل کر کے ان کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔ حالات کے تقاضے کے عین مطابق ان کی تمام تر توجہ خارجہ تعلقات کے بجائے اندرونی محاذ پر مرکوز رہی، اس ضمن میں عام طور پر اپنی جن تقاریر میں انہوں نے خارجہ تعلقات کے موضوع کو چھیڑا بھی ہے، وہ محض اس ضرورت پر زور دینے کے لیے تھیں کہ ایک خوفناک عالمی جنگ کے بعد اب تمام ممالک بحالی اور ترقی کے عمل پر توجہ دیں اور پاکستان کو بالخصوص تمام ممالک اور اقوام، قطع نظر اس کے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، امن اور بھائی چارہ سے رہنا ہوگا۔ تاہم اس کے باوجود انہوں نے ہمسایہ ملک ایران میں جس نے پاکستان کے قیام کے فوری بعد دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا تھا، اپنے ایک انتہائی قریبی دوست اور بااعتماد ساتھی راجہ غضنفر علی خان کو سفیر مقرر کر دیا۔ تہران نے خیر سگالی کی علامت کے طور پر اس بات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی منظور کر لیا کہ وہ برطانیہ کی طرف سے ملنے والے ہوائی جہاز پاکستان کے حوالے کر دے گا۔لیکن درحقیقت جناح کے لیے اصل امتحان ایران کے ساتھ تعلقات کا قیام نہیں بلکہ داخلی مسائل کا مقابلہ کرنا اور مسلمان نمائندگان کی حمایت حاصل کرنا تھا۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ باہم الجھے ہوئے تھے۔ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت حاصل غیر معمولی اختیارات کی بدولت جناح ایمرجنسی کا نفاذ،صوبائی دائرہ اختیار میں آنے والے قوانین کی تشکیل ،وزرا کے تقرر اور برخاستگی کے علاوہ کسی بھی صوبہ میں گورنر راج نافذ کرنے کا اختیار رکھتے تھے جو براہ راست انہیں ہی جوابدہ ہوتا تھا۔ایمرجنسی کا نفاذ اصولی طور پر انتہائی ہنگامی حالات میں ہی کیا جا سکتا ہے تاہم جناح کے نزدیک آزادی کے فوری بعد پیدا ہونے والے حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ اس اختیار کو استعمال کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ قیام پاکستان کے بمشکل ایک ہفتہ بعد ہی ان خصوصی اختیارات کا استعمال عمل میں آ چکا تھا۔

تقسیم برصغیر سے قبل ہی اس بات کے یقین کے لیے صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا انعقاد کیا گیا کہ یہاں کے عوام پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ یہ صوبہ ایک طویل عرصہ سے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کی جماعت سرخ پوش تحریک کا مرکز تھا۔ غفار خان مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبہ سے کہیں پہلے ایک آزاد اور خود مختار پختونستان کا مطالبہ کر چکے تھے۔[۱۰] تاہم ریفرنڈم میں عوام نے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیا اور سرحد پاکستان کا ایک جزو لاینفک بن گیا۔غفار خان کے لیے یہ ایک دوسرا صدمہ تھا کیونکہ اس سے قبل انگریزوں نے برصغیر میں ان کی علیحدہ وطن کی تحریک کو ناکام بنا دیا تھا۔درپیش صورت حال کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے دیگر ذرائع کو استعمال میں لانا شروع کر دیا۔دوسری طرف قائداعظم نے انہیں ایسا کوئی موقع فراہم کیے بغیر ہی آزادی کے ایک ہفتہ بعد سرحدی کانگرس کی حکومت کو برخاست کر دیا جس کے سربراہ غفار خان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب تھے۔اصولی طور پر دیکھا جائے تو ریفرنڈم کے طے شدہ ضابطوں کے مطابق حکومت کی برخاستگی کا یہ فریضہ ماؤنٹ بیٹن کو بطور گورنر جنرل سرانجام دینا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس کے ایسا نہ کرنے کی وجہ سے قائد کو مجبوراً یہ ناگوار فیصلہ کرنا پڑا اور نہ ان کی یہ ضرور خواہش رہی ہوگی کہ اس معاملہ سے زیادہ آئینی اور قانونی طریقہ سے نمٹا جائے۔لیکن جب نہ تو خان صاحب نے از خود استعفیٰ دیا اور نہ پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا تو قائد کے پاس انہیں برخاست کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔[۱۱]

سرحد میں جاری اس تنازعہ کے دوران ہی کشمیر کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔اس ریاست پر قبائلی لشکریوں نے یلغار کی ہوئی تھی جس کو کچلنے میں بری طرح ناکامی کے بعد مہاراجہ نے ریاست کے بچاؤ کے لیے ہندوستان سے مدد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مانگ لی۔ ہندوستان نے اس شرط پر یہ درخواست قبول کر لی کہ مہاراجہ کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کرے۔ دوسری طرف قائد ابھی تک یہ خیال کر رہے تھے کہ مہاراجہ اس درخواست کو قبول نہیں کرے گا۔ چنانچہ آپ نے صورت حال کے جائزہ پر غور وخوض اور حالات سے نمٹنے کے طریقہ کار پر غور کے لیے راجہ غضنفر علی خان کو سرحد کے دورے پر بھیجا لیکن بدقسمتی سے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ خطہ میں پائی جانے والی بیشمار مخاصمتوں کا سدباب کریں۔ چہ جائے کہ وہ ہندو پاک کشیدگی کو دور کرنے کے لیے کسی طریقہ کار کو وضع کر سکیں۔[۱۲]

جناح ہندوستان کے ساتھ جنگ میں نہیں الجھنا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے سیاسی جدوجہد کے دوران اپنی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز رکھی تھی کہ برصغیر میں آباد تمام قومیتیں باہمی محبت اور بھائی چارہ کے ساتھ رہیں۔ اس ضمن میں ان کی جدوجہد ۱۹۱۶ء میں معاہدہ لکھنؤ سے شروع ہو کر ۱۹۴۶ء میں سامنے آنے والے کابینہ مشن تک کو قبول کر لینے پر پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن جب ان کی یہ تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو انہوں نے مجبوراً قوم کو ڈائریکٹ ایکشن کی ہدایت کی۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ اب بھی ایک ایسا قانونی ڈھانچہ تیار کیا جا سکتا ہے جس کی بنیاد پر دونوں ممالک نہ صرف باہمی امن اور سلامتی سے رہ سکتے ہیں بلکہ وہ اپنی توانائیوں کو یکجا کر کے اپنی اپنی سطح پر ایک روشن خیال اور جدید معاشرہ وجود میں لا سکتے ہیں۔ کشمیر کے تنازعے نے اس مقصد کے حصول کو خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔ کیونکہ قائد کو راجہ غضنفر کی رپورٹ کے مطابق یہ مسئلہ محض ہندو مسلم تصادم یا کشمیر میں مسلمانوں کے حقوق کا نہیں تھا بلکہ اس کی اور بھی کئی جہتیں اور حیثیتیں تھیں۔

قیام پاکستان کے موقع پر حل طلب امور نے غفار خان اور ڈاکٹر خاں صاحب کے ارادوں کو نئی جلا بخشی تھی جبکہ اس سے دوسرے مخصوص قبائلی سرداروں کو اپنے اپنے ذاتی مقاصد اور عزائم کو آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ مثال کے طور پر حاجی مرزا علی خان ایپی فقیر جنہیں افغانستان کے ساتھ ملنے والے سرحدی علاقے تیرہ میں بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا، نے پاکستان کی حاکمیت قبول کرنے سے صاف انکار کر کے سرحد پار سے ملنے والی مدد اور استعانت کے بل بوتے پر پختونستان کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کر دی[۱۳] مگر افواج پاکستان نے ایک سخت ایکشن کے بعد اس تحریک کو کچل دیا۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں پاکستان میں پیدا ہونے والی تشویش کو افغانستان کے یہاں پر متعین اولین سفیر نے یہ کہہ کر رفع کرنے کی کوشش کی کہ ان کے ملک کا پاکستان کے کسی بھی سرحدی علاقہ پر حاکمیت کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ تاہم کابل کی طرف سے ان کی ناخوشگوار معزولی کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ افغان پارلیمنٹ دونوں ممالک کے درمیان واقع ڈیورنڈ لائن کو محض تصوراتی لکیر سمجھتی ہے۔

جناح کو حصول آزادی کے بعد زیادہ لمبے عرصہ تک زندگی کی مہلت نہیں مل سکی کہ ان کے جیتے جی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پختونستان افغان حاکمیت کا دعوی سامنے آ سکتا لیکن انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ یہ مسلمان ملک ہندوستان کے ساتھ مل چکا ہے۔ ۱۹۴۸ء کی ابتداء میں افغان شاہ کے نمائندہ نجیب خان نے قائداعظم سے ملاقات کر کے ان پر زور دیا تھا کہ وہ قبائلی علاقہ کو آزاد صوبہ تسلیم کرلیں۔ اس نے مزید یہ مطالبہ کیا کہ پاکستان افغانستان کو سمندری راستہ دے اور یہ کہ ہند و پاک جنگ کی صورت میں ان کا ملک غیر جانبدار رہے گا۔ جناح کے لیے یہ غیر دوستانہ ''مطالبات'' بڑے ہی ناگوار تھے لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس ایسا کوئی حل نہیں تھا جس کے تحت وہ مستقبل قریب یا بعید میں دونوں ممالک کے درمیان تنازعات کو ختم کروا سکتے۔ تاہم جناح کو سرحد کے مسئلہ کی پیچیدگی اور اس کے کشمیر پر پڑنے والے اثرات اور خطّہ میں پائے جانے والے مجموعی تنازعات کا بخوبی احساس تھا جو ان کی حکومت کی اور ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان کے قیام کی کوششوں میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کی برطرفی کے بعد بھی سرحد کے حالات میں کوئی بہتری نہیں پیدا ہو سکی۔ یہاں پر قائم ہونے والی مسلم لیگ کی نئی حکومت کا منصب عبدالقیوم خان نے سنبھالا جو چند ہی سال قبل اسی تنظیم کو موقع پرست اور پختونوں کی قیادت کے لیے نا اہل قرار دے چکے تھے۔ قائد کی قیادت میں تحریک پاکستان کی کامیابی کے بعد انہیں وفاداری بدلنے کے بعد مسلم لیگی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ جب انہوں نے اقتدار سنبھالا تو ایوان میں مسلم لیگ کی ۱۵ جبکہ کانگرس کی ۱۸ نشستیں تھیں۔ جنوری ۱۹۴۸ء تک وہ کانگرس کے سات ممبران کو دباؤ کے ذریعہ اپنے ساتھ ملا کر قائداعظم کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ عام حالات میں جناح ان جیسے وزیراعلیٰ کی سخت گیر انداز حکمرانی اور مختلف حربوں کو قبول نہیں کر سکتے تھے لیکن ایک مضبوط ملک کی تعمیر میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں جناح نے خود سرحد کا دورہ کیا اور مختلف صوبائی رہنماؤں بشمول غفار خان اور ڈاکٹر خان سے ملاقاتیں کیں۔ ان کا خیال تھا کہ ذاتی طور پر یہاں کٹر مخالفین سے ملنے کے بعد شاید نفرتوں میں شاید کچھ کمی واقع ہو سکے گی۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا کہ سیاسی اختلافات کو پس پشت ڈالنا چاہیے۔ لیکن مخالفین کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مسلم لیگ کی حکومت کو تسلیم کریں اور علیحدگی پسند سرگرمیوں کو روک دیں۔ غفار خان نے، جو یقینی طور پر لیگی حکومت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے، قائد کی اس گزارش کو مسترد کر دیا۔ وہ اپنے پروگرام کو ایک ہی طریقہ سے آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اگر انہیں ایک صحیح اپوزیشن پارٹی کا کردار ادا کرنے دیا جائے تو وہ پارٹی کے پروگرام میں ترمیم کرنے پر تیار ہیں۔ جناح نے سرخ پوش رہنما کی اس تجویز کو رد کر دیا جو ان کے خیال میں کسی بھی آئینی نظام کے اندر کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور وہ پاکستان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔[۱۴] اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس منظر میں قیوم حکومت کے غیر آئینی اقدامات کی بھی حمایت کی گئی تاکہ وہ اس خطہ کے باغی عناصر پر اپنا دباؤ برقرار رکھ سکیں۔ اس سخت گیر پالیسی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ صوبہ سرحد کی روایتی اپوزیشن پارٹی کے سامنے آنے کے امکانات دم توڑ گئے۔

صوبہ سرحد اور مسئلہ کشمیر:

برصغیر کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ صوبہ سرحد کو کشمیر میں داخلہ کے لیے قدرتی گذرگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں پر جنم لینے والے تنازعات کا کشمیر پر بھی بڑا گہرا اثر پڑا۔ یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کشمیر کی تحریک پر قبائلی لشکریوں کی آزادی کے موقع پر ریاست میں داخل ہو جانے کے ہی نہیں بلکہ خود سرحد میں مرکز گریز قوتوں کی تحریک کے بھی بڑے منفی اثرات پڑے۔ یہ بات ان طاقتوں کی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ مکمل طور پر بے سروسامان پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ جنگ میں الجھا دیا جائے۔ چنانچہ کشمیر میں جاری تنازعہ کو ہوا دینے سے یقینی طور پر افغانستان کے عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ سمندر تک براراست رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنا ایک مخصوص جیوپولیٹیکل ایجنٹ رکھنے والا یہ ملک کبھی بھی پاکستان کے قیام پر خوش نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنے عزائم کے لیے یہ بڑا ہی نادر موقع تھا کہ پاکستان کشمیر میں ایک ناکام جنگ میں الجھ کر رہ جائے۔ دوسری طرف پاک بھارت جنگ میں سرخ پوشوں کے لیے بھی بڑے امکانات تھے۔ غفار خان کے چونکہ دہلی اور کابل کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات تھے اور پاکستان کا کشمیر کی ایک طویل جنگ میں الجھ کر کمزور پڑ جانا ان کے لیے خوشی کا باعث ہو سکتا تھا۔[۱۵]

پاکستان کے بارے میں گمان یہ کرلیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور تصادم کی صورت میں جلد ہی اس کی فوج اور اسلحہ کے گودام خالی ہو جائیں گے اور ہندوستان کے آگے ہتھیار ڈال دینے کے بعد اس ملک کا جغرافیہ ہی بدل جائے گا جس کا رہنما سفارت کاری کے میدان میں تو گاندھی اور نہرو کو شکست دے سکتا تھا لیکن جنگ کی صورت میں وہ فتح کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ تنازعہ کشمیر کو مذاکرات کے حل کے لیے کبھی بھی پیش نہیں کیا گیا۔

جو عناصر پاکستان کا وجود یا دوسرے الفاظ میں اس کا جغرافیہ بدل دینا چاہتے تھے، انہیں قائد کی گرتی ہوئی صحت میں اپنے عزائم کی تکمیل نظر آ رہی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں جب وہ پنجاب کا دورہ کر رہے تھے تو کئی مواقعوں پر ان کی صحت انتہائی خراب ہوگئی جس کے باعث انہیں صاحب فراش ہو کر اپنا دورہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ جب وہ اسی دوران سرحد کے دورہ پر تشریف لے گئے تو مخالفین پاکستان کو گویا ایک موقع مل گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ کر کہ وہ کتنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کمزور اور نحیف ہو چکے ہیں، اپنی حکمت عملی ترتیب دے سکیں۔ انہیں اگر کسی چیز کا انتظار تھا تو وہ محض قائد کی موت کا انتظار تھا۔ اس دوران انہیں سندھ اور بنگال کے مخصوص حالات کی وجہ سے وہاں کا بھی دورہ کرنا پڑا۔ مؤخرالذکر دورہ تو ان کے لیے خاص طور پر بڑا دقت طلب ثابت ہوا لیکن ان کا خیال تھا کہ عوام کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کا اس دور دراز کے صوبہ کا دورہ ضروری ہے۔ چاہے اس کے لیے انہیں کتنی ہی مشقت کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ اس دورہ کے بعد جب ان کی صحت تشویشناک حد تک خراب ہو گئی تو بظاہر یوں محسوس ہوا جیسے وقت کا پہیہ قائد کے مخالفین کے حق میں گھوم گیا ہے۔

پنجاب کی صورت حال سرحد سے محض کسی حد تک ہی بہتر تھی۔ اس صوبہ کو تقسیم کے نتیجہ میں سب سے شدید اور خوفناک فسادات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ریڈ کلف ایوارڈ کے تحت اس کا شمالی حصہ ہندوستان کا جب کہ مغربی حصہ پاکستان کے وجود کا حصہ بنا۔ ماؤنٹ بیٹن نے سکھوں کے الگ وطن خالصتان کا مطالبہ مسترد کر کے ان کے خواب چکنا چور کر دیے تھے۔ جب تقسیم کے نتیجہ میں پاکستان اور ہندوستان وجود میں آ گئے تو سکھوں نے مسلمانوں کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے پنجاب میں قتل عام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اب اگر تقسیم کا عمل بجائے خود دونوں قوموں میں شدید دوری اور نفرت پیدا کر چکا تھا تو اوپر سے ریڈ کلف ایوارڈ کے ذریعہ کشمیر کی ریاست کو ہندوستان کے حوالے کرنے کی سازش کی گئی۔ اس مقصد کی خاطر صوبہ پنجاب کے مسلم اکثریتی ضلع گورداسپور کو پاکستان کے بجائے ہندوستان کے ساتھ شامل کر لیا گیا تا کہ اس کی ریاست تک براہ راست زمینی رسائی کو ممکن بنایا جا سکے۔ جناح نے اس منصوبے کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام ہو گئے۔ اس مرحلہ پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان برطانیہ کی منشا سے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

مسلم لیگ کے ہاتھوں یونینسٹ حکومت کے خاتمہ کے بعد پنجاب کی صورت حال بے حد خراب ہو چکی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ پر زمینداروں اور دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے وڈیروں کا قبضہ تھا جن کی باہمی مخاصمتوں کی وجہ سے قائد کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ نئی حکومت میں ممتاز دولتانہ کو وزیر خزانہ جب کہ سردار شوکت حیات کو مالیات کا وزیر بنایا گیا۔ لیکن ان دونوں حضرات کی نظریں اس سے بھی بڑے عہدوں پر جمی ہوئی تھیں اور تعلقات مختلف لوگوں سے، خاص طور پر وزیر اعلیٰ ممدوٹ سے خراب تھے۔ صورت حال میں بہتری کی خاطر جناح نے فیصلہ کیا کہ ممدوٹ کو مرکزی کابینہ میں وزیر لے کر دولتانہ کو وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے۔ دولتانہ اس فیصلہ سے قطعاً مطمئن نہیں تھے اور وہ ممدوٹ اور ان کی جماعت کے اراکین سے اپنے اختلافات ختم کرنے کو قطعاً تیار نہ تھے۔[16] جناح نے انہیں حب الوطنی کا حوالہ دیا تو انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ دولتانہ کا یہ جذبہ ان کے جذبے سے قطعاً مختلف ہے۔ جھگڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حل کے لیے کی جانے والی اپنی کوششوں کی ناکامی کے بعد انہوں نے معاملہ انگریز گورنر سر فرانسس موڈی پر چھوڑ دیا جس نے دولتانہ اور شوکت حیات کو استعفیٰ پر مجبور کر کے اقتدار ممدوٹ کے حوالے کر دیا۔

پنجاب میں اقتدار کی کشمکش کے اس تنازعہ کو حل نہ کروا سکنے کے نتیجہ میں ان کی سفارتی کمزوریاں مبالغہ آرائی کی حد تک عیاں ہو گئیں۔ جس طرح انہوں نے اس تنازعہ کو گورنر کی صوابدید پر چھوڑ دیا اور اس نے جس طرح فیصلہ کیا، وہ پنجاب مسلم لیگ کے لیے قطعاً نیک شگون نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اس سے پاکستان کی سفارتی صلاحیتوں کے بارے میں بھی منفی تاثر پیدا ہوا۔ گو جناح ۱۹۵۱ء میں رونما ہونے والے لیاقت علی کے افسوسناک قتل اور ۱۹۵۳ء کے فسادات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے لیکن درحقیقت ان مسائل کی جڑ یہی ابتدائی ناکامی تھی۔ پاکستان میں پنجاب کے حالات کو درست کرنے میں ناکامی کے کشمیر پر بھی اثرات پڑے اور ہندوستان کو ریاست کے مستقبل کے فیصلہ کے لیے استصواب رائے یا مذاکرات کے انعقاد سے بھی روگردانی کی شہہ ملی۔ بعد میں ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان نے اس خطہ پر حملہ کر دیا تو قائداعظم کو بھی مکمل یقین ہو گیا کہ بھارت اس تنازعہ کا بامعنی حل نہیں چاہتا۔ انہوں نے فوج کو جب کشمیر میں ہندوستانی سپاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے حکم جاری کیا تو اس سے ریاست کی آزادی کی تحریک کو ایک جہت مل گئی اور جو مسئلہ تقسیم برصغیر سے قبل ہی مذاکرات کے ذریعے حل کر لیا جانا چاہیے تھا وہ دونوں ممالک کے درمیان خراب سے خراب تر اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

مستقبل پر ایک نظر:

جناح غیر معمولی حالات کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ پاکستان کا حصول ان کا کارنامہ ہے لیکن وہ عمومی حالات کے لیے نہیں تھے، یہ چیز تقسیم برصغیر کے بعد ماہ و ایام کے دوران اور بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ آج پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کی روشنی اور ان معلومات کے ساتھ جس کا قائداعظم کے دور میں اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا، ہم یہ کہہ سکتے ہیں جناح جو جنوبی ایشیا میں ایک آزاد مسلم ریاست قائم کرنے کی صلاحیت رکھنے والے واحد شخص تھے اور جنہوں نے آزادی کے بعد ابتدائی ماہ کے دوران تن تنہا پاکستان کی روحانی معنوں میں پرورش کی تھی، کے پاس آزادی کے بعد نہ تو وقت تھا اور نہ ہی صحت یا توانائی کہ وہ اس ملک کو درپیش انتہائی پیچیدہ اور ہمہ پہلو مسائل کو حل کر سکتے۔ بلکہ انہیں تو اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ اپنے ہم وطنوں تک سول اور جمہوری معاشرہ کے قیام کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کر سکتے۔ انہیں بامر مجبوری اندرونی اور بیرونی مسائل کی وجہ سے نوآبادیاتی دور کے اختیارات استعمال کرنا پڑے۔

عمومی طور پر جناح کو عوام کے ساتھ ساتھ انتظامی افسران اور فوج کی بھی حمایت احترام اور وفاداری حاصل تھی۔ خود ان کی اپنی تنظیم کے اکثر لوگ بھی ان کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن بہرحال یہ کہنا پڑتا ہے اور یہ بات غیر اہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہے کہ ان کے کئی مخالفین اور دشمن بھی تھے۔ وہ گاندھی کے مقابلہ میں تو غیر متنازعہ فاتح بن کر سامنے آئے تھے لیکن وہ ماؤنٹ بیٹن کو شکست نہ دے سکے جس کے بارے میں تاریخ یہ ثابت کرے گی کہ وہ ان کی ضد تھا۔ یہاں اس بات کا پورا پورا امکان موجود ہے کہ اگر قائد بر کین کے سے زیادہ شاطر اور صحیح اور غلط کی تمیز سے ماورا ہو کر کام کرنے والے ہوتے تو وہ وائسرائے کی خوشنودی بھی حاصل کر سکتے تھے۔ اس صورت میں وہ اسے ہندوستان کی پیروی میں پاکستان کا بھی گورنر جنرل تسلیم کر کے اسے تقسیم برصغیر کے بعد کی بھاری ذمہ داریاں ادا کرنے پر آمادہ کر لیتے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی شاید شمالی حصوں میں رونما ہونے والے فسادات کو نہ روکا جا سکتا لیکن اس صورت میں اس بات کا پورا امکان موجود ہوتا کہ رخصت ہوتی ہوئی نو آبادیاتی حکومت زیادہ بہتر طریقہ سے اپنا کردار ادا کرتی اور اپنا تعاون پیش کرتی۔ بلکہ یہ بھی گمان کیا جا سکتا ہے کہ مجوزہ صورت میں اتنا بڑا قتل عام بھی نہ ہوتا کیونکہ ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں قومیتیں اپنی اپنی سطح پر آزادی کے حصول سے مطمئن خوشیاں منا رہی ہوتیں اور دونوں زیادہ مثبت طریقہ سے اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے اور ان کا ایک دوسرے کے بارے میں رویہ بھی مختلف ہوتا۔

ہندوستان کی طرف اگر ماؤنٹ بیٹن جس کا تقسیم برصغیر کے عمل میں بڑا بنیادی کردار تھا کو پاکستان کا بھی حکمران تسلیم کر لیا جاتا تو اس کی حکمت عملی شاید مختلف ہوتی۔ ایسی صورت میں وہ ریڈکلف کے ذریعہ دونوں ممالک کے درمیان جغرافیائی خاص طور پر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے فیصلہ پر بھی نظر ثانی کرتا۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ ریڈکلف نے کبھی ہندوستان دیکھا تک نہیں تھا لیکن اس کے کاندھوں پر چند ہفتوں کے اندر تقسیم برصغیر کی بھاری ذمہ داری عائد کر دی گئی۔[۱۷] انگریزوں نے کس طرح جلدی میں اپنی سب سے بڑی کالونی کو خیر باد کہا اس کا اندازہ بعد میں رونما ہونے والے سنگین واقعات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت اس پورے عمل میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے وجود میں آنے والی دو الگ ریاستوں سے زیادہ شخصی تصادم کا عمل دخل زیادہ تھا۔

آج جب کشمیر کا تنازعہ پچاس سالوں کے بعد بھی بدستور حل طلب ہے اور اس پر دو پاک بھارت جنگوں کے بعد ایک تیسری لیکن زیادہ خطرناک جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے تو ماضی کے حکمرانوں کی اس مسئلہ کے حل کروانے میں ناکامی کھل کر سامنے آئی ہے لیکن دوسری طرف اس سے موجودہ حکمرانوں کی نااہلیت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ وہ اس قضیہ سے نجات کے لیے ذاتی اور شخصی کمزوریوں سے بالا ہو کر عمل نہیں کر سکے۔ قائداعظم کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ آزادی کے بعد کی بھاری ذمہ داریوں کو ادا کر سکتے۔ ان کے لیے شاید بہتر یہی تھا کہ وہ گاندھی کی طرح سیاسی تنازعات سے دور ہی رہتے۔ اس صورت میں وہ اپنے ایک جدید پاکستان کے قیام کے خواب کی تعبیر کے لیے کامیابی سے جدوجہد کر سکتے تھے۔ سیاست کا ''کھیل'' بدستور موجود رہنے سے جناح نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے والے صوبائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاست دانوں کے ہاتھوں اپنے آپ کو خراب کروایا۔ ان سیاست دانوں کا کوئی طے شدہ ایجنڈا ہی نہیں ہوتا تھا۔ مزید برآں نئے زیر تشکیل سیاسی عمل میں پیدا ہونے والی روزمرہ شدید مشکلات کی وجہ سے وہ ایسا کوئی پلیٹ فارم بھی نہیں ترتیب دے سکے جس کی بنیاد سے ایک زیادہ مضبوط اور ٹھوس پاکستان وجود میں آ سکتا۔ کشمیر کبھی بھی قائد اعظم کے لیے اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ نہرو کے لیے جو اس ہمالیائی ریاست کو اپنے آباؤ اجداد کی میراث قرار دیتا۔ علاوہ ازیں درست بات یہ تھی کہ اس ریاست کی حیثیت کی وجہ سے دونوں ممالک مشترکہ طور پر بہتری کے لیے اپنی اپنی کوششیں کرتے۔

مزید برآں دونوں ممالک کے رہنما برطانیہ کے اقتدار کی منتقلی کے فارمولہ کی خراب نوعیت کا بھی ادراک کر کے اس کے فی نفسہٖ تنازعہ کا باعث بننے والے پہلوؤں کی تلافی کی کوشش کرتے۔ خود پاکستان کو اپنی دھرتی ماں ہندوستان سے الگ نہ ہونا پڑتا۔ اس کی علیحدگی کا عمل ارتقائی ہوتا جو دونوں ممالک کے مشترکہ تجربہ سے پھوٹتا جس سے دشمنی کی بجائے دوستی سے یہ مرحلہ تمام ہوتا۔

یہاں یہ اہم بات پیش نظر رہے کہ کسی بھی دوسرے مسئلہ سے زیادہ یہ مسئلہ کشمیر دونوں ممالک کے درمیان شک وشبہہ اور دشمنی کے فروغ کا منبع ہے۔ پاکستان سے اس کے مشرقی بازو کے الگ ہو جانے پر اتنا شور نہیں سنائی دیا جتنا کشمیر کے مسئلہ پر سننے میں آتا ہے۔ اس مسئلہ نے ایک طویل عرصہ سے دونوں ممالک کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور ان میں سے کئی ایسا کوئی حل پیش کرنے سے قاصر ہے جو دونوں فریقین کے لیے قابل قبول ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں کے دوران اس مسئلہ پر کوئی نئی تجویز یا خیال سامنے آیا ہی نہیں ہے۔ پاکستان کا اصرار ہے کہ تنازعہ کا اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت استصواب رائے کروا کر فیصلہ کیا جائے جبکہ ہندوستان مسئلہ کو بھی مردہ سمجھتا ہے اور ریاست کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دیتا ہے۔ گو دنیا اس مسئلہ کی وجہ سے پریشانی کا شکار ہے لیکن عملاً یہ تنازعہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب بظاہر مردہ ہو چکا ہے۔ دونوں ممالک اسے اپنی قومی تشخص کا ایک حصہ بنا چکے ہیں جس سے پیچھے ہٹنا ان کی نظر میں موت گردانا جائے گا۔

جناح نے ظفر اللہ خان اور ایم اے ایچ اصفہانی کو اس مسئلہ پر پاکستان کی اقوام متحدہ میں نمائندگی کے لیے مقرر کر رکھا تھا لیکن تاریخی طور پر ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ ادارہ اس مسئلہ کے حل کے لیے مناسب فورم تھا۔ ابتدا میں اس نے دونوں ممالک کے درمیان اس مسئلہ پر ثالثی کی کوشش کی تھی لیکن کسٹر نمٹز اور فرانک گراہم اس کوشش میں رہے کہ کسی ایسے حل پر پہنچ سکیں جو دونوں ممالک کے لیے قابل قبول ہو۔ سویت یونین نے سرد جنگ کی ابتدا کے زمانہ میں اس تنازعہ میں مداخلت کی تھی لیکن اس کی بھارت نوازی کا اتنا نتیجہ ہی برآمد ہو سکا کہ دونوں فریقین اپنی اپنی پوزیشن پر اور ڈٹ گئے۔ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی حالات میں کوئی بہتری نہیں آئی ہے۔ آج جس طرح دنوں ممالک اکثر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایٹمی جنگ کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں، جناح اگر ایسا سن لیتے تو وہ یقیناً بڑے ناخوش ہوتے۔

۱۹۴۸ء میں جناح کشمیر سے کوئٹہ اور وہاں سے زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ قائد کو آگاہ کیے بغیر ہی غفار خان کو فرنٹئیر کرائم ریگولیشنز کے تحت گرفتار کرلیا گیا جو ان کی بعد میں کئی گرفتاریوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ گرفتاری سے قبل غفار خان نے پاکستان کو ''ریت کا گھروندہ'' اور جناح کو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا تھا۔ اس کے مطابق غیر ملکی پاکستان میں حکومتی دور چلا رہے تھے جس سے مقامی لوگ اپنے ہی ملک میں مہاجر بن کر رہ گئے تھے۔[18] اس سے یہ بالکل واضح تھا کہ وہ جناح کو اس بحران کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس سے قبل جناح کے سرحد کے دورے اور غفار خان سے ملاقات کے دوران ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی کہ آزادی کے فوراً بعد دونوں رہنما اپنے اپنے کردار کے بارے میں نئے سرے سے جائزہ لے سکتے۔ جناح کے لیے تو اس کے لیے ضروری تیاری کا موقع ہی نہ مل سکا لیکن غفار خان ان کے بعد کئی عشروں تک زندہ رہے اور گاندھی کی وفات کے بعد ہندوستان میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے لیکن پاکستان کے بارے میں وہ اپنے آپ کو قائداعظم کے موقف کا حامی نہ بنا سکے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل فوج کے نام اپنے ایک ریڈیو پیغام میں قائداعظم نے فرمایا کہ گو کہ پاکستان پر سے مشکلات کا دور ابھی ختم نہیں ہوا ہے لیکن ''سب سے کٹھن وقت بہرحال گزر چکا ہے''[19] اب یہ تاریخ اور پاک ہند رہنماؤں پر منحصر ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ کیا قائد اپنے اس قول میں سچے تھے۔

حوالہ جات

۱۔ Loenard Mosley, *The Last Days of the British Raj,* (New York : Harcourt,1961),p.153-57.

۲۔ Ian Stephens, *Pakistan,*(New York,Peager),1963,p.15.

۳۔ Chaudhri Mohammad Ali, *The Emergence of Pakistan,*(Lahore : Research Society of Pakistan),1973,p.234-36.

۴۔ Ziauddin Ahmad, *Liaquat Ali Khan: Leader and Statesman,* (Karachi : The Oriental Academy, 1970),p.105.

۵۔ M.A.H. Ispahani, *Quaid-i-Azam As I knew Him,*(Karachi: Din Muhammad Press 1966),p.222-23

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ Fazal Muqueem Khan , *The Story of the Pakistan Army,* (Karachi: Oxford University Press,1963),p.41.

۷۔ Aziz Beg, *Captive Kashmir,*(Lahore: Allied Business Corporation, 1957),p.88-89.

۸۔ ایم۔ایچ۔اصفہانی سے ذاتی انٹرویو،۳فروری ۱۹۷۵ء

۹۔ Hamid Yusuf, *Pakistan in Search of Democracy, Manuscript,p.29.*

۱۰۔ D.G. Tendulkar, *Abdul Ghaffar Khan,* (New Delhi, Gandhi Peace Foundation,1967),p.63-64.

۱۱۔ Lord Birdwood, *A Continent Deciedes, (London, Robert Hale, 1953),p.35.*

۱۲۔ Sharif-al Mujahid, *Quaid-i-Azam Jinnah: Studies in Interpretation,* (Karachi Quaid-i-Azam Academy, 1981),p.225.

۱۳۔ Mujtaba Rizvi, *The Frontiers of Pakistan,* (Karachi: National Publishing House, 1971),p.145-54.

۱۴۔ نوراحمد، مارشل لا سے مارشل لا تک، مترجم محمد علی، مینوسکرپٹ، سطر۳

۱۵۔ S.M. Burke and Lawrence Ziring, *Pakistan's Foreign Policy,* (Karachi: Oxford University Press, 1990) ,p.68-69.

۱۶۔ نوراحمد، بحوالہ سابقہ، ص۴۔۷

۱۷۔ لونارڈ موسلے، بحوالہ سابقہ، ص۱۹۳۔۹۹

۱۸۔ نوراحمد، ص۱۰۔۱۱

۱۹۔ ایضاً، ص۳

© rasailojaraid.com